پروفیسر خالد شبیر احمد
سیکرٹری جنرل مجلس احرار اسلام

قسط ۱۷

اکابرِ اسلام اور قادیانیت

چنانچہ بعد کے حالات نے میری توجیہات کی تصدیق کی، بدانجام کا یہ شخص (مرزا بشیر الدین) فالج میں مبتلا ہو کر کئی سال تک گھسٹتا رہا اور ایڑیاں رگڑتے جہنم رسید ہوا۔ ایک ڈاکٹر نے جو آخری ایام میں اس کا معالج تھا' نے بتایا کہ وہ انتہائی ضعیف العقل ہو چکا تھا اور کلمہ یا اور کسی اور دعا کی بجائے فحش اناپ شناپ بکتے اس نے دم توڑا۔

ان سب توجیہات کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی، جس کے تحت میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس ایک فرد کا قتل بے نتیجہ اور بے اثر ہوگا۔ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ قادیان کے معاشرے میں اس قسم کی بدچلنیاں اور بدمعاشیاں اس ایک شخص کے مرجانے سے ختم نہیں ہونگی۔ صرف یہ بدذات شخص اکیلا جنسی خبط میں مبتلا نہ تھا، بلکہ اس کے دونوں بھائی اور نام نہاد ''خاندان نبوت'' کے اکثر افراد بھی اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی اکثر نمائشی داڑھیوں کو لہراتے اپنی اپنی سیاہ کاریوں کے اڈے سجائے بیٹھے تھے اور یہ سب کچھ ان لوگوں کی آپس میں اس خاموش تفہیم کے ماتحت ہو رہا تھا کہ ''تم میری داڑھی کو نہ نوچو' میں تمہاری داڑھی کو نہ نوچوں گا''

درحقیقت قادیان کے نظام میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر اکثر اسی قماش کے لوگوں کا ہوتا تھا۔ جو مرزا کے اسلوبِ زندگی اور ان جنسی قدروں کو اپنا لیتے تھے یعنی اس خاندان کی مطلق العنان جیسی قدروں کے مطابق جس خاندان کو یہ لوگ ''خاندان نبوت'' کے نام سے کرنے کی جرأت اور گستاخی کرتے ہیں۔ یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ اس قسم کے اخلاقی قیود سے آزاد عیاشیوں کی افواہیں باہر بھی پھیلنا شروع ہوگئیں اور باہر سے اوباش نوجوان اس جماعت میں شامل ہونے لگے۔ تاکہ ان جنسی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں جو ایشیائی تمدن وثقافت ان پر عائد کرتا ہے اور اسی طرح یہ شیطنت مآب دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

خلیفہ کے اس خفیہ اڈے سے قطع تعلق کر لینے کے بعد میری زندگی دائمی طور پر خطرہ میں رہنے لگی۔ اس کے غنڈوں نے سایہ کی طرح میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ ایسے مایوس کن اور پُرخطر حالات میں میرے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا، سوائے اس کے کہ کھلم کھلا مقابلہ پر اتر آؤں اوانجام خدا پر چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں خلیفہ سے ملنے گیا اور اسے ایک تحریر کی نقل دکھائی۔ جس میں مَیں نے اس کے کرتوتوں کی تفصیل لکھی تھی، اور اس کے شرکائے جرم کے نام، تاریخیں وغیرہ درج تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس تحریر کی نقول میں نے بعض ذمہ دار احباب کے پاس محفوظ کرا لی ہیں اور انہیں ہدایت کی

ہے کہ ان لفافوں کو میری موت یا میرے لاپتہ ہوجانے کے بعد کھولنا۔ اس منصوبہ بندی نے مطلوبہ مقصد پورا کردیا، اور میں بلاخوف وخطر آزادی سے قادیان کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔

جیسے جیسے مجھ پر قادیان کے گندے ماحول کا انکشاف ہوتا گیا، اسی نسبت سے میں مذہب سے بیزار ہوتا گیا۔ صرف قادیانی مذہب سے ہی نہیں، بلکہ مجموعی طور پر مذہب کے ادارے سے اور بتدریج یہ حالت دہریت تک پہنچ گئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سقیم حالت نے ایک روحانی خلا بھی پیدا کردیا۔ جس کو خود پُر کرنے کے لیے میری تنہا ذات میں طاقت نہ تھی۔ مجھے اپنے والد صاحب (شیخ عبدالرحمٰن مصری) کو یہ سب حالات بتانے پڑے۔ جو طبعاً ان کے لیے صدمہ کا باعث ہوئے۔ قدرتاً وہ ایک بچے کی باتوں کو بلاتصدیق مان نہیں سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے محتاط طور پر تحقیقات کرنا شروع کردی اور کچھ عرصہ میں ان پر ثابت ہوگیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

میرے والد صاحب نے اس نام نہاد خلیفہ کو ایک خط لکھا۔ جس میں مطالبہ کہ وہ ان الزامات کی تکذیب کرے یا اپنی بدکاریوں کا کوئی شرعی جواز پیش کرے یا پھر خلافت سے معزول ہوجائے۔ اس خط کا خلیفہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن دو مزید خطوط کے بعد اس نے اعلان کردیا کہ شیخ عبدالرحمٰن مصری (یعنی میرے والد صاحب) اور ان کے خاندان کے سب افراد کو جماعت سے خارج کرکے ان کا مقاطعہ کیا جاتا ہے۔ میرے والد صاحب کے تینوں خطوط اس زمانے میں چھپ گئے تھے۔

اس قسم کے مقاطعہ کے اصل ہتھکنڈے یہ ہوتے تھے کہ کسی شخص یا خاندان کا کُلیۃً بائیکاٹ کرکے اس کا ''حُقہ پانی'' بند کردیا جاتا تھا۔ ان حالات میں ہمارے خاندان کی جانیں اتنے خطرے میں تھیں کہ حکومت کو ہماری حفاظت کے لیے فوجی پولیس کے دستے متعین کرنا پڑے جو ۲۴ گھنٹے ہمارے مکان کے گرد پہرہ دیتے تھے۔ ہم میں سے کسی کو بغیر پولیس کی نگرانی کے گھر سے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس قسم کی حفاظتی پیش بندیوں کے، مجھ پر اور میرے دو ساتھیوں پر قادیان کے بڑے بازار میں دن دھاڑے حملہ ہوگیا، میرے ایک سن رسیدہ ساتھی کو چاقو کا گھاؤ لگا۔ جس سے وہ جاں بحق ہوگئے۔ دوسرے ساتھی کو گردن اور کندھے پر چاقو کے زخم آئے اور انہیں کافی عرصہ ہسپتال رہنا پڑا۔ مجھے پروردگار نے اس طرح بچالیا کہ میرے ہاتھ میں ایک پہاڑی ڈنڈہ تھا جو میں نے حملہ آور کی کھوپڑی میں اتنے زور سے مارنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس زخمی حملہ آور کو اس کے شرکائے جُرم سہارا دے کر آناً فاناً غائب ہوگیا اور اسے ایک ایسی پوشیدہ جگہ چھپادیا جو پہلے سے معین کررکھی تھی لیکن پولیس اس کے سر سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرات دیکھ کر وہاں پہنچ گئی اور اسے گرفتار کرلیا۔ عدالت عالیہ میں اس کا جرم ثابت ہوا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس زمانہ کی قادیان ''ریاست'' میں امن وقانون کی اتنی برملا تحقیر کی گئی۔ قاتل کی میت کا جلوس دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اور خلیفہ نے خود نمازِ

جنازہ پڑھائی۔ جو قادیانی مریدوں کی نظر میں بڑی عزت افزائی سمجھی جاتی تھی۔

اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت ''مجلس احرار اسلام'' نے ہماری حفاظت کے لیے رضا کاروں کے جتھے بھیجنا شروع کر دیئے' جو فوجی پولیس کے علاوہ تھے۔ ان رضا کاروں نے ہمارے بنگلے کے گرد میدان میں خیمے نصب کر دیئے اور ہمارا گھر ایک محصور قلعہ کی طرح بن گیا۔ اس اثناء میں مرزائی ٹولے نے میرے والد کو جعلی مقدمات میں اُلجھانا شروع کر دیا تا کہ جماعت میں ان کی ساکھ اُٹھ جائے نیز یہ کہ ان پر مالی بوجھ پڑے۔ الغرض وہ تمام کمینی چالیں چلی گئیں جن سے ان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اپنے گیارہ بچوں پر مشتمل کنبے کی پرورش کے لیے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں خاندانی زیورات اور گھر کا ساز و سامان بیچ بیچ کر گزارا کرنا پڑا۔ ان آفات انگز معاملات کا سب سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ اس دوران خاندان کے بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں خلل پڑ گیا۔ ہم اس حملہ اور دیگر زیادتیوں کے حالات ہندوستان کے اخبارات میں باقاعدہ بھیجتے رہے تھے۔

ہمارے خاندان کو سرکاری افسران اور بہت سے مخلص دوست احباب کی طرف سے یہ ترغیب دی جا رہی تھی کہ ہم قادیان سے نقل مکانی کر لیں۔ چنانچہ ہم طوعاً اور کرھاً لاہور منتقل ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میرا ایمان بحیثیت مجموعی ہر مذہب سے اُٹھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو ان بندشوں سے آزاد رکھا۔ زندگی کے اس دور میں میرا تعلق مجلس احرار اسلام کے سرکردہ احباب سے بڑھنا شروع ہو گیا، جو میرے لیے بہت روح افزا ثابت ہوا۔ ان بزرگوں میں سے بعض کے نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، چوھدری افضل حق صاحب، مولانا مظہر علی اظہر صاحب۔ ان سب کو قریب سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ یہ لوگ نیک سیرت مسلمان اور پُر خلوص دوست ہیں۔

گو میرے والد صاحب نے میری دہریت کو ظاہراً تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ دل میں یہ صدمہ ان کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے، وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ میرے لیے دعا کرتے ہیں اور مجھے بھی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ میں دعاؤں کے ذریعے اللہ سے ہدایت کا طالب رہوں۔ اس کا جواب میں یہ دیا کرتا تھا کہ آپ مجھ سے ایک ایسی ہستی سے دعا کرنے کو کہہ رہے ہیں جس کا وجود ہی نہیں۔ ایک عرصہ کی بحث و مباحثہ کے بعد انہوں نے یہ مشورہ دینا شروع کیا کہ میں اپنی دعاؤں کو مشروطی رنگ میں کیا کروں۔ اور میں نے اس قسم کے اناپ شناپ الفاظ میں دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ ''یا اللہ مجھے یقین ہے کہ تیری کوئی ہستی نہیں ہے۔ لیکن اگر تیری ہستی ہے تو اس کی کوئی علامت مجھ پر ظاہر کر، ورنہ مجھے قابلِ الزام و ملامت نہ ٹھہرانا کہ میں تجھ پر ایمان نہ لایا'' وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ راسخ العقیدہ مؤمنوں کی نظر میں اس قسم کی دعا کلمۂ کفر کے مترادف ہے اور اللہ سبحانہ

وتعالیٰ کی شان پاک میں بے ادبی ہے۔لیکن اس کے باوجود میری اس طرح کی دعائیں میرے لیے کارگر ثابت ہوئیں کہ ایک سال کے عرصہ میں ہی ان کے روحانی نتائج نکل آئے۔ مجھے تواتر کے ساتھ دو خواب دکھائے گئے۔ چونکہ وہ خواب شخصی اور نفسیاتی کیفیت کے ہیں، اس لیے ان کے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ خواب خصوصاً دوسرا خواب بڑا لمبا آسانی سے سمجھ آنے والا اور مربوط تھا۔ایسا کہ مجھ ایسے گنہگار کے لیے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی یہاں پر اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ دوسرے خواب کے آخری لمحات میں مجھے مرزائی خلیفہ کا چہرہ دکھایا گیا، جو بھیانک طور پر سیاہ فام اور فسق وفجور سے مسخ شدہ تھا۔ان خوابوں کے بعد میرے دل ودماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کتاب زندگی کا نیا ورق اُلٹا کر باضابطہ اسلام قبول کرلوں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے اپنے ساتھ مہروی لے گئے۔ مہروی دہلی سے چند میل پر وہ قصبہ ہے جہاں مولانا محمد الیاس صاحب جیسے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہوا۔اس مبارک موقعہ پر حُسنِ اتفاق تھا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی موجود تھے۔مغرب کی نماز پڑھانے کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب اور چالیس کے قریب معتقدین نے میرے حق میں دعا کی۔

۱۹۴۱ء میں مشرقی افریقہ ہجرت کر گیا۔ ہندوستان کو خیر باد کہتے ہوئے میرے احساسات مسرت والم کا مرکب تھے۔بمبئی کی بندگاہ، میں جہاز کے عرشہ پر کھڑے زیرلب، میں قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت کر رہا تھا۔

> ''اور تمہارے پاس کیا عذر برأت ہے کہ تم ان ضعیف وبے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی مدد کے لیے اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے جو آہ وزاری سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نجات دلوا، جس کے باشندے ظالم ہیں'' (سورۃ نساء آیت ۷۵)

افریقہ میں بیس سال کی سکونت کے بعد میں نے ۱۹۶۱ء میں انگلینڈ ہجرت کر لی۔ جہاں پہلے ۴ برس کے قریب بطور طالب علم، اپنی تعلیمی کمزریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔اس کے بعد ''اسلامک ریولو'' رسالہ کا بالا اشتراک ایڈیٹر بن گیا۔۱۹۶۴ء میں شاہ جہاں مسجد ووکنگ کا سب سے پہلا سنی امام مقرر کیا گیا۔ یہ مسجد برطانیہ میں سب سے پہلی مسجد تھی۔ اور اس زمانے میں سارے یورپ میں اسلامی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ پانچ سال کی امامت کے بعد ۱۹۶۸ء میں مستعفی ہوکر بذریعہ کار تقریباً ۴۳ ممالک کا تین برس تک دورہ کرتا رہا۔جن میں زیادہ تر اسلامی ممالک تھے۔اس دورہ کا اصل مقصد اپنی ایک دیرینہ خواہش کو پورا کرنا تھا کہ بلاتوسط بچشم خود مطالعہ کروں کہ اسلامی دنیا میں، عوام النّاس کس طرح اسلامی قدروں کو عملی طور پر نبھا رہے ہیں۔ میری ہنگامی اور نزاعی زندگی میں خدا نے جو سب سے زیادہ مسرت بخشی، اسلام کی خدمت کرنے کی مجھے توفیق دی، وہ یہ تھی کہ ووکنگ مسجد کی امامت سے مستعفی ہونے سے قبل ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس مسجد اور مرکز میں اب کبھی بھی کسی مرزائی امام کا تقرر نہیں ہوسکتا۔وما توفیقی الا باللہ۔(جاری ہے)